بڑے مشفق استاذ تھے، کم وبیش چالیس سال سے مدینہ منورہ میں مقیم تھے اور تحفیظ القرآن کی خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ ان کی بہت سی یادیں ذہن میں تازہ ہو رہی ہیں جن میں سے ایک کا سرِ دست تذکرہ کرنا چاہتا ہوں کہ 1977ء میں تحریک نظام مصطفیٰ کے دوران پاکستان قومی اتحاد کے ایک جلوس کی قیادت والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کر رہے تھے، ان کے ساتھ استاذ محترم قاری محمد انورؒ اور جے یو پی کے راہنما حاجی سید ڈارؒ بھی تھے۔ جلوس کو روکنے کے لیے فیڈرل سکیورٹی فورس کے کمانڈر نے ایک جگہ لائن لگا کر اعلان کیا کہ اس سے آگے بڑھنے والے کو گولی ماردی جائے گی۔ اس کے ساتھ ہی چاروں طرف سنگینیں تن گئیں جن کا رخ اس لائن کی طرف تھا۔ حضرت والد محترمؒ یہ سن کر اپنے ان دونوں ساتھیوں کے ہمراہ کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے سرخ لائن عبور کر گئے اور فرمایا کہ ''مسنون عمر پوری کر چکا ہوں اور اب شہادت کے لیے تیار ہوں''۔ ان تینوں حضرات کی اس جرأت رندانہ پر سنگینوں کا رخ زمین کی طرف ہو گیا اور فیڈرل سکیورٹی فورس نے پسپائی اختیار کر لی۔

حضرت مولانا عبد الحفیظ مکیؒ کے ساتھ تحریک ختم نبوت کے محاذ پر گزشتہ تین عشروں سے میری مسلسل رفاقت چلی آ رہی تھی۔ انہوں نے 1985ء میں لندن میں پہلی انٹرنیشنل ختم نبوت کانفرنس منعقد کرنے کا پروگرام بنایا تو ان کے رفقاء کی ٹیم میں حضرت مولانا علامہ خالد محمود، حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ اور حضرت مولانا محمد ضیاء القاسمیؒ کے ساتھ میں بھی شامل تھا۔ تب سے تحریک ختم نبوت کے محاذ پر ہماری باہمی رفاقت وتعاون کا سلسلہ چلا آ رہا تھا اور میں نے ان کی دعوت واہتمام پر اسی سلسلہ میں جنوبی افریقہ کا بھی دو دفعہ سفر کیا۔ وہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کی خدمت میں کافی عرصہ رہے اور ان کے خلیفہ مجاز تھے۔ حضرت شیخ کا رنگ ان کی زندگی میں نمایاں دکھائی دیتا تھا۔ وہ مکہ مکرمہ کی معروف دینی درسگاہ مدرسہ صولتیہ میں حدیث وفقہ کی تدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے ہیں اور تحریک ختم نبوت کے لیے کام کرنے والی بین الاقوامی تنظیم ''انٹرنیشنل ختم نبوت موومنٹ'' کے سربراہ ہونیکے ساتھ ساتھ اپنے شیخ کی طرز پر خانقاہی نظام میں خاصے متحرک وفعال تھے۔

یہ صدمہ تمام اہل دین کا مشترکہ صدمہ ہے اور قیامت کی نشانیوں میں سے ہے کہ اہل علم یکے بعد دیگرے اٹھتے جا رہے ہیں مگر ان کی جگہ سنبھالنے کے لیے نعم البدل تو کجا کوئی بدل بھی دکھائی نہیں دے رہا۔ اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کے درجات جنت میں بلند سے بلند تر فرمائیں اور ہم سب کو ان کی حسنات کی پیروی کی توفیق سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

معاصر اسلامی معاشروں کو درپیش فکری تحدیات

گفٹ یونیورسٹی گوجرانوالہ نے سالِ گزشتہ کا اختتام ''معاصر اسلامی معاشروں کو درپیش فکری تحدیات'' کے موضوع پر دو روزہ قومی کانفرنس سے کیا جو ۳۰ و ۳۱ دسمبر ۲۰۱۶ء کو منعقد ہوئی اور اس کی مختلف نشستوں سے ڈاکٹر محمد ضیاء الحق، پروفیسر ڈاکٹر معراج الاسلام ضیاء، ڈاکٹر مستفیض احمد علوی، ڈاکٹر غلام عباس، ڈاکٹر عاصم ندیم، ڈاکٹر ریاض محمود، ڈاکٹر شہباز احمد منج، ڈاکٹر محمد سعد صدیقی، ڈاکٹر محمد حماد لکھوی، ڈاکٹر عبد القدوس حبیب، ڈاکٹر حافظ حسن مدنی، ڈاکٹر حافظ محمود اختر، ڈاکٹر محمد اکرم ورک، غازی عبد الرحمٰن قاسمی، جناب محمد مجتبیٰ، ڈاکٹر سلطان شاہ، حافظ محمد عمار خان ناصر اور دیگر

ارباب فکر و دانش نے خطاب کیا۔ جبکہ گفٹ یونیورسٹی کے ریکٹر ڈاکٹر قیصر شہریار درانی کی نگرانی میں کانفرنس اختتام کو پہنچی۔ راقم الحروف کو آخری نشست میں کچھ معروضات پیش کرنے کا موقع ملا جس کا خلاصہ نذر قارئین ہے۔

بعد الحمد والصلاۃ۔ گفٹ یونیورسٹی گوجرانوالہ کو اس کانفرنس کے انعقاد پر مبارکباد پیش کرتا ہوں جو یونیورسٹی کی علمی وفکری سرگرمیوں میں ایک اچھی پیش رفت ہے۔ مجھے چند سالوں سے یہ دیکھ کر خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ ملک کی جامعات میں علمی وفکری سرگرمیوں کے حوالہ سے اضافہ ہو رہا ہے اور خاص طور پر ان جامعات کے شعبہ ہائے علوم اسلامیہ دینی وملی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے کانفرنسوں اور سیمینارز کا اہتمام کر رہے ہیں۔ اور ایک طرح سے صحت مندانہ مقابلہ کا رجحان دیکھنے میں آ رہا ہے جو یقیناً خوش آئند ہے کہ قرآن کریم نے بھی خیر کے اعمال میں وفی ذلک فلیتنافس المتنافسون کہہ کر اس کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اسلامی علوم کے ان شعبوں میں علمی وفکری سرگرمیوں میں اضافہ کے ساتھ دوسری بات جو خوشی اور اطمینان کا باعث بن رہی ہے، یہ ہے کہ یونیورسٹیوں کے فضلاء اور دینی مدارس کے فضلاء میں میل جول بڑھ رہا ہے جو وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ان سرگرمیوں میں شریک ہونے والے اور ان کا اہتمام کرنے والے اساتذہ وطلبہ میں دونوں طرف کے فضلاء شریک ہیں۔ پی ایچ ڈی اسکالرز میں دینی مدارس کے فضلاء کی تعداد روز افزوں ہے اور دینی مدارس کے اساتذہ وفضلاء کی دلچسپی اس میں مسلسل بڑھ رہی ہے جو ہمارے پرانے خواب کی تعبیر ہے کہ قدیم وجدید علوم کے ماہرین یکجا بیٹھیں اور مل جل کر دینی، قومی، علمی اور ملی مسائل میں قوم کی راہنمائی کریں۔

حضراتِ محترم! ہماری اس قومی کانفرنس کا بنیادی موضوع وہ فکری تحدیات اور چیلنجز ہیں جو اس وقت امت مسلمہ کو درپیش ہیں اور جن میں صحیح سمت راہ نمائی کے لیے پوری امت ارباب فکر و دانش اور اصحابِ علم وفضل کی طرف دیکھ رہی ہے۔ ہمارے بہت سے فاضل دوستوں نے اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا ہے۔ میں گفتگو کے آغاز سے پہلے سوچ رہا تھا کہ فکری چیلنجز کے کون سے دائرے میں بات کروں گا؟ اس لیے کہ فکری چیلنجز کا ایک دائرہ یہ ہے کہ انسانی سوسائٹی کے عالمی ماحول میں امت مسلمہ کو متعدد اہم فکری چیلنجز درپیش ہیں، جبکہ ملت اسلامیہ کو داخلی سطح پر بھی بہت سی فکری تحدیات کا سامنا ہے اور ہم اپنے قومی ماحول یعنی پاکستانی قوم کے اندرونی دائروں میں مختلف فکری چیلنجز سے نبرد آزما ہیں۔ مجھ سے پہلے ڈاکٹر محمد اکرم ورک صاحب نے اپنی گفتگو میں ''گلوبل سوسائٹی'' کی بات کر کے میری یہ مشکل آسان کر دی ہے اس لیے میں بھی اسی حوالہ سے چند گزارشات پیش کرنا چاہوں گا۔

پہلی بات یہ ہے کہ ہمارے متعدد فاضل مقررین نے بجا طور پر یہ کہا ہے کہ ہمیں ان فکری تحدیات کا مقابلہ کرنے کے لیے قرآن کریم اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت وسیرت سے راہنمائی حاصل کرنا ہوگی، اس لیے کہ راہنمائی کے لیے ہمارا اصل علمی وفکری سرچشمہ وہی ہے اور اسی سے فیض حاصل کر کے ہم نہ صرف اپنے بلکہ نسل انسانی کے مسائل ومشکلات کا حل تلاش کر سکتے ہیں۔

جناب نبی اکرمؐ کی سیرت وسنت کے بارے میں ایک پہلو کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں کہ (۱) حدیث (۲) سنت (۳) سیرت کے تینوں شعبوں کا سرچشمہ جناب رسول اللہؐ کی ذات گرامی ہے۔ لیکن ان تینوں میں

باہمی طور پر فرق موجود ہے جس کی وجہ سے محدثین کرام اور ائمہ عظام نے ان تینوں کے حوالہ سے علمی ذخیرہ الگ الگ عنوانات کے ساتھ جمع ومرتب کیا ہے۔ احادیث نبویہؐ کا دائرہ الگ ہے، سنت وشریعت کا دائرہ مستقل ہے، اور سیرت و سوانح کا دائرہ ان دونوں سے مختلف ہے۔ ہماری علمی وفکری راہنمائی کا سرچشمہ یہ تینوں دائرے ہیں مگر میں اپنے اس طالب علمانہ تاثر اور احساس کا اظہار کرنا چاہوں گا کہ مسائل واحکام کے استنباط اور استدلال میں حدیث اور سنت سے جس قدر استفادہ کیا گیا ہے اور کیا جا رہا ہے، سیرت کی طرف ہماری اس قدر توجہ نہیں ہے۔ ممکن ہے میرا یہ احساس درست نہ ہو، لیکن ایک طالب علم کے طور پر میں یہی محسوس کر رہا ہوں اور اس رائے کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ حدیث اور سنت کی طرح سیرت کو بھی ہمارے استنباط واستدلال کی مستقل بنیاد ہونا چاہیے۔ خصوصاً آج کی انسانی سوسائٹی کو درپیش مشکلات ومسائل کے حل کے لیے اس طرف زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔

میرا تاثر یہ ہے کہ جناب رسول اکرمؐ نے جس طرح اپنے قول اور عمل کے ساتھ امت کی راہنمائی فرمائی ہے، اسی طرح خاموش حکمت عملی اور طرز ورویہ کے ساتھ بھی بہت سے مسائل حل کیے ہیں جو ہمارے لیے قیامت تک مشعل راہ ہیں۔ اس طرز عمل اور مسلسل رویہ کی تلاش سیرت کے علمی ذخیرہ میں زیادہ آسانی کے ساتھ کی جا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر میں دو باتوں کا ذکر کروں گا۔

ایک مثال یہ کہ جناب رسول اللہؐ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو وہاں کے ماحول میں یہ تبدیلی سب نے دیکھی کہ آنحضرتؐ کی تشریف آوری کے بعد باقاعدہ حکومت قائم ہوگئی جس کے سربراہ رسول اکرمؐ خود تھے اور اس کے بعد دس سال تک آپؐ نے ایک حاکم کے طور پر مدینہ منورہ میں زندگی گزاری۔ یہ مدینہ منورہ کے ماحول میں بہت بڑی تبدیلی تھی جس نے پورے جزیرۃ العرب کے مستقبل کا رخ ہمیشہ کے لیے تبدیل کر دیا۔ لیکن اس دوران ''میرے عزیز ہم وطنو!'' قسم کا کوئی خطاب حدیث وتاریخ کے ذخیرے میں کہیں دکھائی نہیں دیتا، البتہ آنحضرت کی وہ خاموش ڈپلومیسی ضرور دکھائی دے گی جس کے نتیجے میں نہ صرف حکومت کا وجود قائم ہوا بلکہ ''میثاقِ مدینہ'' کے عنوان سے دستوری خاکہ بھی تشکیل پا گیا۔

دوسری قابل توجہ مثال یہ ہے کہ مدینہ منورہ میں جناب رسول اکرمؐ پر ایمان کا اظہار کرنے والوں میں منافقین کا وہ گروہ بھی شامل تھا جسے قرآن کریم نے وما ھم بمؤمنین اور انھم لکاذبون کا خطاب دیا ہے۔ آپ کو اس گروہ کے ساتھ جہاد کرنے کا حکم قرآن کریم میں ان الفاظ میں ہوا کہ جاھد الکفار والمنافقین واغلظ علیھم۔ مگر نبی اکرمؐ نے پورے دس سال تک اس گروہ کے خلاف معروف معنوں میں کوئی جہاد نہیں کیا، نہ عسکری کارروائی کی اور نہ ہی کوئی اجتماعی ایکشن لیا۔ البتہ حکمت عملی ایسی اختیار کی کہ وہ بتدریج سوسائٹی میں تحلیل ہوتے چلے گئے حتیٰ کہ خلافت راشدہ کے دور میں اس قسم کے کسی گروہ کا مدینہ منورہ میں سراغ نہیں ملتا۔

جناب رسول اللہؐ کی یہ حکمت عملی اگر ظاہری نصوص میں تلاش کی جائے تو شاید استدلال واستنباط کے معروف دائروں میں نہ ملے، لیکن آپ کے مسلسل طرزِ عمل کا مطالعہ کیا جائے تو اس کا ایک ایک مرحلہ ترتیب کے ساتھ سامنے آ جاتا ہے۔ یہ دو باتیں میں نے بطور مثال پیش کی ہیں ورنہ اس پہلو سے سیرت طیبہ کا مطالعہ کیا جائے تو بہت سے امور

ایسے ملیں گے جن کی بنیاد آنحضرتؐ کے کسی صریح ارشاد یا متعین عمل پر نہیں بلکہ مسلسل طرز عمل اور رویہ پر دکھائی دے گی۔ اس لیے میں یہ گزارش کر رہا ہوں کہ حدیث وسنت کی طرح سیرت کو بھی استنباط واستدلال کا مستقل ماخذ بنانے کی ضرورت ہے جو اصلاً تو حدیث وسنت کے دائرہ میں ہی شامل ہے، لیکن وہ امتیاز وفرق جس کی وجہ سے سیرت کو حدیث و سنت سے الگ کر کے علمی ذخیرہ میں مستقل طور پر پیش کیا گیا ہے، وہ استنباط واستدلال میں بھی نمایاں ہونا چاہیے۔ اور فقہ القرآن، فقہ الحدیث اور فقہ السنکی طرح ''فقہ السیر ۃ'' کو بھی علمی حلقوں میں موضوع بحث بنایا جانا چاہیے۔

دوسری بات یہ عرض کروں گا کہ اس وقت انسانی سوسائٹی میں فکر وفلسفہ اور تہذیب وثقافت کی جو کشمکش جاری ہے، وہ رفتہ رفتہ فیصلہ کن مراحل کی طرف بڑھ رہی ہے اور اگرچہ دیگر تہذیبیں اور فلسفے بھی اس کشمکش میں شریک نظر آتے ہیں، لیکن فائنل راؤنڈ اسلام اور مغربی تہذیب وفلسفہ کے درمیان ہی ہوگا۔ مغرب کا فلسفہ وتہذیب اس وقت غالب و قابض فلسفہ ہے جبکہ اسلامی فکر وفلسفہ نہ صرف مزاحمت کر رہا ہے بلکہ انسانی سوسائٹی کی قیادت حاصل کرنے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ان دونوں فلسفوں اور تہذیبوں کے درمیان اس بات پر کشمکش جاری ہے کہ مستقبل میں گلوبل انسانی سوسائٹی کی قیادت کون کرے گا؟ مغرب تو موجودہ کیفیت کو ''اینڈ آف دی ہسٹری'' قرار دے کر اپنے دائمی قبضے کا اعلان کر رہا ہے، لیکن اسلامی تہذیب وثقافت نے دست برداری اور سپر اندازی قبول نہیں کی اور ابھی ان دونوں کے درمیان جنگ جاری ہے جس کا حتمی نتیجہ آخری راؤنڈ کے بعد ہی سامنے آئے گا۔ مغرب کے پاس قبضہ اور قوت ہے جس کے باعث وہ خود کو فاتح سمجھ رہا ہے جبکہ مسلمانوں کے پاس دلیل اور حسین ماضی ہے جس کے سہارے وہ یہ جنگ لڑ رہے ہیں۔

ہمارا موضوع چونکہ فکری تحدیات ہیں، اس لیے دلیل کی دنیا میں ایک بات کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا کہ مغرب کی دانش کو اس بات کا اندازہ ہو گیا ہے کہ وجدانیات، وحی اور آسمانی تعلیمات سے مکمل دستبرداری کے انسانی سوسائٹی پر منفی نتائج سامنے آئے ہیں، اس لیے اس پر نظر ثانی کی بہرحال ضرورت ہے۔ یہ بات سابق برطانوی وزیر اعظم جان میجر ''بیک ٹو بیسکس'' کے ٹائٹل کے ساتھ کہتے رہے ہیں، شہزادہ چارلس ''وجدانیات کی طرف واپسی'' کی ضرورت کا احساس دلاتے رہتے ہیں، جبکہ امریکی یونیورسٹیوں میں وحی اور عقل کے درمیان توازن کی تلاش تحقیقی سرگرمیوں کا اہم عنوان بن چکی ہے۔ میں سیاست اور طاقت کے میدان کی بات نہیں کر رہا کہ وہاں تو مغرب کی مکمل اجارہ داری ہے مگر دلیل کی دنیا میں مغربی دانش کی ایک سطح اپنے فکر وفلسفہ کی بنیادوں کا از سرِ نو جائزہ لے رہی ہے۔ اس سلسلہ میں ریورس گیئر لگ چکا ہے اور الٹی گنتی شروع ہو گئی ہے جو ہمارے لیے ایک بہت بڑے علمی وفکری مشاہدہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا ہم مغرب کو اس واپسی کے لیے ''باعزت راستہ'' دینے کے لیے تیار ہیں؟ ہمارا مزاج اور نفسیات کم وبیش اس طرح کی بن چکی ہیں کہ ناک کی لکیریں نکلوائے بغیر کسی کو واپسی کا راستہ دینا ہمارے لیے مشکل عمل ہوتا ہے۔ جبکہ میرے خیال میں اب اس کی ضرورت بڑھتی جا رہی ہے کہ ہم دلیل و دانش کی دنیا میں مغرب کو واپسی کا باعزت راستہ دینے کی فکر کریں، اس کی راہ نمائی کرتے ہوئے اس کے سامنے اسلام کی آفاقی تعلیمات کو آج کی زبان اور مغرب کی نفسیات کا لحاظ رکھتے ہوئے پیش کریں، اور عقل اور وحی کے مابین توازن کے مکالمہ میں شریک ہو کر وحی کی

ضرورت و برتری کو ثابت کریں۔ میری طالب علمانہ رائے میں اس وقت ہمارے جامعات اور دینی مدارس کو سب سے زیادہ اس بات کی طرف توجہ دینی چاہیے کہ جس طرح مغرب نے ''استشراق'' کے نام سے اسلام اور مسلمانوں کا وسیع اور گہرا مطالعہ کیا ہے اور اسے ہمارے خلاف پوری مہارت کے ساتھ استعمال کیا ہے، اسی طرح ہم بھی مغرب کے فلسفہ وتہذیب اور معاشرت کا مطالعہ کریں اور تحقیق و تجزیہ کے ذریعہ اس کی غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے اسلامی احکام و قوانین کی برتری کو واضح کریں۔ یہ کام بہت محنت طلب ہے اور جگر کاوی کا عمل ہے کہ اس کے لیے دماغ کی اعلیٰ صلاحیتوں کے استعمال میں قلب و جگر کا خون بھی جلانا ہوگا۔ یہ سطحی اور جذباتی کام نہیں ہے لیکن اس کے بغیر اب بات آگے نہیں بڑھے گی، یہ کام بہرحال کرنا ہوگا اور جامعات کو دینی مدارس و مراکز کے ساتھ مل کر کرنا ہوگا۔

موجودہ عالمی ماحول میں فکری تحدیات کا تیسرا دائرہ میری طالب علمانہ رائے میں یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں حکومتوں کی نہیں بلکہ بین الاقوامی معاہدات کی حکومت ہے۔ معاہدات نے پوری دنیا کو جکڑ رکھا ہے۔ میرے نزدیک صرف وہ پانچ ملک اس وقت آزاد ملک کہلانے کے مستحق ہیں جن کے پاس سلامتی کونسل میں ''ویٹو پاور'' ہے، ان کے علاوہ دنیا کا کوئی ملک اس طرح کا آزاد اور خودمختار ملک نہیں ہے کہ وہ اپنی پالیسی اپنی اور اپنے عوام کی مرضی سے خود طے کر سکے۔ سب کے سب بین الاقوامی معاہدات کے اسیر اور پابند ہیں جن سے انحراف کی صورت میں وہی کچھ ہوتا ہے جو افغانستان اور عراق میں ہو چکا ہے۔ ان معاہدات کا ایک پہلو یہ ہے کہ انہوں نے سیاسی طور پر حکومتوں کو جکڑ رکھا ہے اور ان کی خودمختاری کو قبضے میں لیا ہوا ہے۔ جبکہ اس کا دوسرا پہلو علمی، فکری اور تہذیبی ہے کہ یہ معاہدات مغربی تہذیب و فلسفہ کے علاوہ باقی سب کی نفی کر رہے ہیں اور ان کی زد میں سب سے زیادہ اسلام کے احکام و قوانین ہیں۔ قرآن و سنت کے احکام و قوانین کو بین الاقوامی معاہدات کی چھلنیوں سے گزار کر ان کی نفی کی جا رہی ہے، استہزاء کا نشانہ بنایا جا رہا ہے اور مسلمانوں پر ان سے دستبردار ہونے کے لیے ہر طرح کا دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔

اس صورت حال کا علمی و فکری تقاضا یہ ہے کہ ان کا گہرائی کے ساتھ جائزہ لیا جائے، اسلامی عقیدہ و ثقافت کے ساتھ ان معاہدات کے ٹکراؤ اور تضادات کی نشاندہی کی جائے اور اسلام کا موقف واضح کیا جائے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ سب معاہدات کو یکسر مسترد کر دیا جائے اور نہ ہی یہ کہ انہیں من و عن قبول کر لیا جائے۔ یہ دونوں باتیں درست نہیں ہوں گی، اصل ضرورت اس امر کی ہے کہ بین الاقوامی معاہدات اور اسلامی تعلیمات کا تقابلی جائزہ لے کر بتایا جائے کہ کون سی باتیں قابل قبول ہیں اور کون سی قابل قبول نہیں ہیں۔ کن باتوں پر کسی درجہ میں مفاہمت ہو سکتی ہے اور کون سے امور ہیں جنہیں کسی طور پر بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اس حوالہ سے مغرب کو ایک متوازن موقف سے دوٹوک طور پر آگاہ کرنا ضروری ہے اور اس سلسلے میں امت مسلمہ کی راہنمائی ضروری ہے جو ہماری یونیورسٹیوں اور دینی مراکز کے کرنے کا کام ہے اور سنجیدہ علمی شخصیات کی نگرانی میں کرنے کا کام ہے۔

آخر میں گفٹ یونیورسٹی گوجرانوالہ کی اس علمی و فکری کاوش پر ایک بار پھر یونیورسٹی انتظامیہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دعاگو ہوں کہ اللہ رب العزت ہم سب کو اسلام اور امت مسلمہ کی صحیح خدمت کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔